ڈاکٹر دبیر عباس*

اسلم انصاری کی کتاب "اقبال عہد آفریں" کا تنقیدی جائزہ

A Critical Analysis of Aslam Ansari's Book "Iqbal Ehd Aafreen"

Abstract:

Allama Iqbal is a poet as well as a philosopher of Urdu and Perian Language. The dissemination and universality of Iqbal's thought and art took him out of individuality and made him a cultural heritage. His philospocial poetry has a complete system of life in it. It not only invites contemplation but also inspires action. Dr. Aslam Ansari has a special attachment to Iqbal and Iqbal's thought. He is a prominet contemporary Urdu poet. Aslam Ansari also has a prominent recognition as an Iqbal scholar. He has not only studied Iqbal with great effort and understandable awareness, but he has also studied the basic sciences that are required to understand Iqbal's knowledge very seriously. These sciences include philosophy, history, culture, anthropology and fine arts. He has written many critical books about the thought and art of Iqbal. "Iqbal Edh Aafreen" is one of them. In this article, a critical analysis of this unique poetic creation has been made.

Keywords: Iqbal, Aslam Asnari, Iqbal Ehd Aafreen, Art, Poetry, Thought, Construction, Combination, Style

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج، میانی

ڈاکٹر اسلم انصاری اردو ادب میں شاعری کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ وہ اپنے عہد کی ذاتی صداقتوں اور اجتماعی حقیقتوں کے شاعر ہیں۔ قدرت نے انھیں صداقت کے شعری اظہار کا کمال سلیقہ عطا کر رکھا ہے۔ اُن کی غزل ندرتِ خیال، اُسلوب کی تازگی اور سادگی کے سبب منفرد پہچان رکھتی ہے۔ اُن کی غزل میں محبت جیسی آفاقی قدر کا اثبات ذاتی، اجتماعی اور کائناتی حوالوں سے نظر آتا ہے۔ غزل کے ساتھ ساتھ ان کے قلم سے بے شمار جاں گداز نظمیں بھی تخلیق ہوئیں جو اُن کی پہچان کا سبب بنیں۔ حقیقی اور سچی شاعری ہی اسلم انصاری کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے۔

اسلم انصاری اقبال شناس کے طور پر بھی ایک نمایاں پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور قابلِ فہم شعور کے ساتھ نہ صرف اقبال کا مطالعہ کر رکھا ہے بلکہ اقبال شناسی کے لیے جن بنیادی علوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اُن کا مطالعہ بھی بہت سنجیدگی سے کر رکھا ہے۔ ان علوم میں فلسفہ، تاریخ، ثقافت، علومِ بشریات اور فنونِ لطیفہ قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال شناسی کے ضمن میں اُن کی تنقیدی کُتب ہی اہمیت کی حامل نہیں بلکہ اُن کی منظوم کتاب "فیضانِ اقبال" بھی منفرد نوعیت کی تخلیق ہے۔ یہ شعری تخلیق نقادانِ اقبال کے منتخب افکار و خیالات پر مبنی منظوم ریڈیائی تشکیل ہے۔ اِس میں نقادانِ اقبال کے افکار و نظریات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو اسلم انصاری کے فنِ شعر اور اقبالیاتی مطالعے میں اُن کی دسترس رکھنے پر ایک دلیل ہے۔ اس وقت ہمارے زیرِ مطالعہ ان کی تصنیف "اقبال عہد آفریں" ہے۔ یہ کتاب پہلی بار کاروانِ ادب، ملتان سے 1987ء میں جب کہ دوسری بار اقبال اکادمی، لاہور سے 2011ء میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اسلم انصاری کی اوّلین نثری تخلیق بھی یہی کتاب ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کی تعداد سترہ ہے۔

اسلم انصاری کی اقبال پر اس اوّلین کتاب "اقبال عہد آفریں" کا پہلا مضمون بھی اِسی عنوان سے کتاب ہذا میں شامل ہے۔ اِس مضمون میں اسلم انصاری نے فنونِ لطیفہ بالخصوص شاعری کی اہمیت بیان کرنے کے بعد اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ پر عمومی بحث کی ہے۔ اسلم انصاری کے مطابق اقبال کی شاعری کا اہم جزو اُن کا 'تاریخی شعور' ہے اور اُن کی شاعری نے برِ صغیر کے اذہان کو حتّٰی کہ سرسید تحریک سے بھی بڑھ کر متاثر کیا۔

اسلم انصاری نے اقبال کی شعری اصناف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ اقبال نے غزل کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اُسے نئی تشبیہات، استعارے اور علامتیں عطا کیں۔ اسی طرح غزل کے روایتی موضوعات کو بھی اقبال نے جدید موضوعات سے بدل کے رکھ دیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ "اقبال نے حکیمانہ موضوعات اور نظری مسائل کو غزل میں جگہ دی"(1)۔ اسلم انصاری، ایلیٹ کے تصورِ روایت کو حوالہ دیتے ہوئے، اقبال کی شاعری کو پیش روؤں کی شاعری سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ فلسفے کے ضمن میں بھی انھوں نے اقبال کے فلسفۂ خودی کو کانٹ اور برگساں جیسے فلسفیوں کے نظریات سے اہم قرار دیا ہے۔

اسلم انصاری کے مطابق شاعری تخیّل جب کہ فلسفہ منطق سے جنم لیتا ہے جو بالترتیب عقل اور فکر سے نمو پاتے ہیں۔ لہٰذا شاعری میں فلسفہ کی موجودگی ممکن ہے، جس کی بڑی مثال اقبال کی شاعری ہے۔ غالب کے ہاں بھی یہ انداز ہے لیکن استعاراتی زبان میں۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے اکابر علما و حکما کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اُن کی فکر سے اکتسابِ فیض بھی حاصل کیا لیکن مولانا روم کی فکر کو جس طرح انھوں نے

سمجھا اور تفہیم کی، یہ اُسی کا حصہ ہے۔ اسلم انصاری، اقبال کے فلسفۂ خودی کو مغربی مفکرین کانٹ اور برگساں کے نظریات سے ممتاز قرار دیتے ہیں۔ یہ مضمون، اقبال کے فن اور فلسفے کا جامع تجزیہ پیش کرتا ہے۔

"اقبال کی بیانیہ شاعری" کتاب کا دوسرا مضمون ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں اسلم انصاری نے غزل اور مثنوی کی موضوعاتی تفریق پر بحث کر کے شاعری میں بیانیہ عناصر پر گفتگو کی ہے۔ اُن کے مطابق بیانیہ شاعری کی اپنی حدود ہوتی ہیں، جس میں سیدھا سادہ بیانیہ انداز اپنایا جاتا ہے، اس میں پہلو داری اور کثیر المعنویت عموماً ناپید ہوتی ہے، حتیٰ کہ فردوسِ گم گشتہ اور خمسۂ نظامی میں بھی یہی انداز غالب ہے، لیکن اقبال نے بیانیہ کو بھی تخلیقیت میں ڈھال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی فطرت نگاری بھی بیانیہ نہیں بلکہ اس میں بھی تخلیقی رجحان نمایاں ہے۔

اقبال فطرت کو یوں بیان نہیں کرتا جیسے نظر آتی ہے بلکہ اس کے برعکس تخلیقی صلاحیت پر بھروسا کرتے ہوئے اس میں کئی اضافے کرتا ہے۔ اسلم انصاری اقبال کی بیانیہ شاعری کو فطرت اور صورتِ واقعہ میں تقسیم کرتے ہیں۔ فطرت کے ضمن میں فضابندی اور منظر آفرینی کو بیان کیا گیا ہے جب کہ صورتِ واقعہ کے ضمن میں محاکاتی اور ڈرامائی شاعری کو بیان کیا گیا ہے۔

فطرت کے عنوان کے تحت اقبال کے پسندیدہ فطری مناظر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فطرت کے دو بڑے مظاہر پہاڑ اور سمندر ہیں۔ اقبال، سمندر سے زیادہ پہاڑ کو اہمیت دیتے ہیں کیوں کہ پہاڑ کی بلندی، سختی اور استقامت اقبال کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسلم انصاری کے مطابق پہاڑ سے اقبال کی دلچسپی کا ثبوت یہ ہے کہ اقبال کی اوّلین نظم کوہسارِ ہمالہ کے بارے میں ہے۔ اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی میں بھی پہاڑ کو ایک کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ مولانا صلاح الدین کے خیال میں شاعرِ مشرق نے کوہِ صحرا سے ایسی خلاقی کیفیات منسوب کی ہیں، جن کا تعلق انسان کی سیرت اور کردار کے ارتقا سے ہے(2)۔ کوہسار کے بعد اقبال کی وابستگی آبِ رواں سے نظر آتی ہے۔ لیکن اسلم انصاری کے مطابق یہ آبِ رواں ان کی شاعری میں آبشار، جوئے تنک آب اور آبِ جو سے بڑھ کر دریا اور سمندر کم ہی بنتا ہے۔

صورتِ واقعہ کے ضمن میں اسلم انصاری نے "بانگِ درا" کی ایک نظم "غلام قادر رُہیلہ" کی ایک مثال پر تفصیلی گفتگو کی ہے، جس میں اقبال نے کردار، فضا، موڈ اور مکالمہ جیسے تمام ڈرامائی عناصر کے ذریعے واقعیت نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

اقبال، اسلام کی حقانیت اور روحانیت پر کامل یقین رکھنے والے مسلمان تھے۔ رسولِ پاکؐ سے ان کی جذباتی وابستگی اُن کے فکر و فلسفے کا بنیادی نکتہ ہے۔ اسلم انصاری نے اقبال کی فارسی اور اردو شاعری کے حوالے سے "اقبال اور عشقِ رسولؐ" میں اسی والہانہ وابستگی کو موضوع بنایا ہے۔ اسلم انصاری نے اقبال کی ذاتی زندگی سے چند واقعات کے ذریعے اُن کی رسولِ اکرمؐ سے جذباتی وابستگی کی مثالیں پیش کرنے کے بعد اقبال کی شاعری پر بحث کی ہے، جو ان کے خیال میں آغاز سے لے کر نکتہ کمال تک رسولِ پاکؐ کی مدح سے لبریز ہے۔

اقبال عہد آفریں کے چوتھے مقالے "اقبال کا تصورِ تاریخ (ابن خلدون اور اشپنگلر کے افکار کی روشنی میں)" کی تمہید میں اسلم انصاری نے جدید مغربی مفکرین کے تصورات پر روشنی ڈالی ہے۔ جدید مغربی مفکرین میں ہیگل وہ مفکر ہے جس نے تاریخ کو ایک جدلیاتی عمل قرار دیا ہے، جس میں اشیاء ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنی ضد کو جنم دیتی ہیں۔ لہٰذا قوموں کا عروج و زوال اگرچہ ان کی بے بسی اور لاچارگی کو ظاہر کرتا ہے، لیکن یہ تبدیلی نئی زندگی کا پیش خیمہ بھی ہوتی ہے۔ اسلم انصاری بھی جدید مغربی مفکرین میں ہیگل کو اس لیے اہمیت دیتے ہیں کہ اس

نے پہلی بار تاریخی عمل میں انسانی ارادے کی اہمیت کا ذکر کیا۔ اُن کے مطابق یونان سمیت دوسرے مغربی مفکرین تو تاریخ کے بارے میں کوئی واضح نقطۂ نظر پیش کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ کارل لووِتھ اور وجودی فلسفی کارل جیسپر جیسے مفکرین بھی تاریخ کو ناقابلِ فہم عمل اور انسان کی رہنمائی کے لیے ناکافی قرار دیتے ہیں۔

جرمن مفکر اشپنگلر (1880-1936) کی تصنیف "زوال مغرب" نے اہلِ علم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اشپنگلر تاریخ کو ارتقاء اور نشوونما سے عاری قرار دیتا ہے، اس کے نزدیک تاریخ مقصد نہیں مقدر ہے، ہر تہذیب کا ایک حیاتیاتی دورانیہ ہوتا ہے۔ پیدائش، نشوونما اور بڑھاپے کے مراحل سے گزر کر تہذیب موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے خیال میں تہذیبوں کے درمیان مشابہت تو ہو سکتی ہے، لیکن ان میں لین دین نہیں ہو سکتا۔ اشپنگلر کے تصور تاریخ میں فرد ایک مجبور اور غیر فعال حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کو مجوسی قرار دیتا ہے، جس کی بنیاد اسی کے خیال میں خیر اور شر کی دوئی پر لکھی گئی ہے۔ اسلم انصاری کے مطابق اشپنگلر کا تہذیبوں کی نامیاتی وحدت کا نظریہ طبع زاد نہیں، بلکہ ابن خلدون سے مستعار ہے۔ مغربی تہذیب پر تنقید اور اس کے زوال، تہذیبوں کی نشوونما اور اسلام کے بارے میں اس کی غلط فہمی کے سبب اقبال نے اشپنگلر کے افکار و خیالات کا بغور جائزہ لیا۔

اشپنگلر کے نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اسلم انصاری ابن خلدون کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری میں تیونس میں پیدا ہوا۔ اس نے کم سنی میں مروجہ علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ اکتیس سال کی عمر میں تیونس کے بادشاہ کا "کاتب العلامہ" مقرر ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سے سفر کئے، جامعتہ الازہر میں لیکچر دیے، قاہرہ کا قاضی القضا مقرر ہوا اور امیر تیمور سے ملاقات بھی کی، جو اس کی علمیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ اور مقدمہ، قلعہ ابن سلامتہ میں تین سال کی گوشہ نشینی کے دوران 779ھ میں مکمل کی، جو ایک مقدمہ اور سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کا مقدمہ ایک الگ تصنیف کے طور پر "مقدمہ ابن خلدون" کے نام سے مشہور ہوا۔

ابن خلدون نے تاریخ کو ایک ایسا علم قرار دیا، جو ہمیں گذشتہ اقوام کے احوال و اخلاق سے آگاہی دیتا ہے۔ اس بنیاد پر اس نے تاریخ کو 'خبر' کا نام دے کر، عبرت اندوزی اور حکمت افروزی سے بھرپور علم قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ کے عمل میں تغیّر اور اصولِ حرکت کارفرما ہے اور یہ ایک مراجعتی یا دَوری علم ہے، جس میں واقعات ایک دائرے کو مکمل کرتے ہیں، ہر نیا دائرہ پہلے دائرے سے مشابہت رکھتا ہے۔

اشپنگلر اور ابنِ خلدون کے تصورات کا جائزہ لینے کے بعد اسلم انصاری نے اقبال کے تصورِ تاریخ پر بحث کرتے ہیں۔ اشپنگلر تاریخی عمل میں ارتقائی حرکت سے انکار کرتا ہے جب کہ اقبال، اس کے برعکس تہذیب کے ارتقاء پر یقین رکھتے ہیں۔ اسلم انصواری نے اقبال کے چوتھے خطبے کا حوالہ دیا ہے، جس میں اقبال یقین کی اہمیت بیان کرتے ہیں کہ تقدیر پرستی اپنی ذات کی نفی نہیں اثبات کا نام ہے۔ پروفیسر جابر علی سید، اشپنگلر کے نظریات سے بیک وقت استفادہ اور اختلاف کو اقبال جیسے بڑے مفکر اور حوصلہ مند مسلمان فلسفی کی توازن پسندی اور جامعیت کا معمولی سا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ (3)

اسلم انصاری کے مطابق اقبال کا تصورِ تاریخ قرآن پاک کی سورۂ اعراف کی اُس آیت سے ماخوذ ہے، جس کا مفہوم ہے کہ ہر امت کے لیے وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ مؤرخین کے حوالے سے اقبال کا تصورِ تاریخ بہت حد تک ابن خلدون اور ایک خاص حد تک البیرونی سے

مستعار ہے۔ لیکن فی الحقیقت ابنِ خلدون بھی تاریخ کی ارتقائی حرکت کا واضح اقرار نہیں کرتا، البتہ اقبال تاریخ کے مسلسل ارتقا اور تخلیقی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اقبال اس سلسلے میں قرآن کے استقرائی اصول سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، جس کو تاریخی استقراء کا نام دیا جاسکتا ہے، یعنی کسی موضوع کے بارے میں خارجی شواہد مرتب کر کے اس کا محاکمہ کرنا۔ اقبال نے اپنی ذاتی ڈائری میں تین مقامات پر تاریخ کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اوّل، تاریخ ایک اطلاقی اخلاقیات ہے۔ دوم، تاریخ کی روداد کو تسلیم کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے اور سوم، تاریخ ایک گراموفون ہے، جس میں گزری ہوئی قوموں کی آوازیں محفوظ ہیں۔(4)

اقبال کا تصور تاریخ ان کے تصورِ زماں سے ابھرتا ہے۔ اگرچہ وہ زمانے کو بھی ارتقاء پذیر سمجھتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے نزدیک ایک تخلیقی حرکت کے طور پر زمانی ارتقاء میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اسلم انصاری کے الفاظ میں:

> انسانی ارادہ اور عمل تاریخ کو ایک اخلاقی اور باطنی مفہوم عطا کرتے ہیں۔ یہ ارادہ اور عمل ہی ہیں، جو اقبال کے تصور تاریخ کو ان کے تصور خودی سے مربوط کرتے ہیں۔(5)

ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول "اقبال تاریخ کو ایک فکری اور روحانی تسلسل سمجھتے ہیں، جو انسان میں اعتماد اور ایقان کے اوصاف پیدا کرتا ہے"(6)۔ اقبال کے تصور میں تاریخ خود بینی، خود گری اور خود سازی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ تاریخی عمل میں انسانی خودی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اقبال کے خیال میں تاریخ کے جبری ظلم کو خودی کی قوت ہی توڑ سکتی ہے۔ اسلم انصاری نے "رموزِ بے خودی" سے ایسے اشعار درج کیے ہیں، جن میں اقبال نے تاریخ کو 'بختِ اقوام کا کوکب' کہہ کر پکارا ہے۔ اقبال کے تصور تاریخ میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کارفرما نظر آتے ہیں اور اقبال کی یہی خصوصیت انھیں دوسرے مفکرین سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلم انصاری کا یہ مضمون ایک اہم اور افکر انگیز مضمون ہے۔ یہ مضمون نہ صرف اقبال کے تصورِ تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے، بلکہ اسلم انصاری کے وسیع مطالعۂ تاریخ کا بھی عکاس ہے۔

کتاب کے پانچویں مضمون میں اسلم انصاری نے "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کا جائزہ برصغیر پاک وہند کے مسلم اکابرین کے افکار کی روشنی میں لیا ہے۔ خطبات سے تشکیل شدہ فکری نظام کی مناسب درجہ بندی مشرق و مغرب کی علمی اور فلسفیانہ روایات سے آگاہی کا تقاضا کرتی ہے۔ کیوں کہ خطبات مرتب کرتے وقت مشرق اور مغرب کی علمی روایات، اقبال کے پیشِ نظر رہیں۔ اسلم انصاری کے نزدیک فکرِ اسلامی کے سلسلے میں اگرچہ دبستانِ سرسید اور خیر آبادی مکتبِ فکر، اسلامی فکر کی بعض بہترین روایات کا امین رہا ہے لیکن برصغیر کی گذشتہ پانچ سو سالہ فکرِ اسلامی کی تاریخ کی میں اہم ترین تصانیف "مکتوباتِ امامِ ربانی"، "حجتہ اللہ البالغتہ" اور "خطباتِ اقبال" ہیں۔ تینوں تصانیف میں بھی اہم ترین خطبات ہیں۔ کیوں کہ حضرت مجدد الف ثانی کے "مکتوبات" کا موضوع فرد ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی "حجتہ البالغہ" کا خطاب اُس وقت کے معاشرے کے ساتھ ہے۔ "خطباتِ اقبال" اس لیے اہم ہے کہ اس میں فرد اور معاشرہ دونوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے لیکن اسلم انصاری شکوہ کناں ہیں کہ خطباتِ اقبال پر علمی اعتبار سے قابل قدر توجہ نہیں دی گئی۔ وہ خطباتِ اقبال کو 'نادریافت شدہ' علمی خزانہ قرار دیتے ہیں(7)۔ اُن کا شکوہ بجا ہے۔ ایسا ہی شکوہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی کیا:

> خطبات سمیت اگر اقبال کی نثری کاوشوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کی جدید اسلامی جمہوری فلاحی ریاست کا ماڈل صاف دکھائی دینے لگے گا۔ یہ ماڈل سعودی یا دیگر مختلف اقسام کی 'مسلم ملوکیت' یا بیشتر مسلم ممالک میں نافذ مختلف انواع کی مطلق العنان 'آمریت'، ایرانی

'ولایت فقیہہ' کے نظریے، طالبان کی 'گذشتہ شورائیت پر مبنی سنی امارات' یا ترکی کی 'سیکولر ریاست' سے مختلف ہے، لیکن اسے دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی نہ ہی تعلیم و تربیت، قانونی اصطلاحات، معاشی تصورات یا جدید مسلم تہذیبی اسلوب سے متعلق ان کے افکار کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔(8)

اقبال عصرِ حاضر کے فکری مسائل کا حل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی روح کی بیداری کے بھی خواہاں تھے۔ اسلم انصاری کے خیال میں اقبال جدید سائنسی ترقی کو مذہبی صداقت کے احیاء کا ذریعہ خیال کر رہے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر مغرب کی کھوکھلی ترقی کے مقابلے میں اسلام کے روحانی تشخص کی بحالی تھی۔ اقبال نے 'بے رحم انانیت' اور 'ناقابلِ تسکین جوعِ زر' کی تراکیب کے ذریعے دورِ جدید کے انسان کی نفسیات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اقبال نے مروّجہ مشرقی تصوف پر بھی اگرچہ کڑی تنقید کی ہے، لیکن وہ مذہب کے علمی جواز کو صوفیانہ واردات میں تلاش کرتے ہیں۔ گویا اقبال کے نزدیک مذہب کی اندرونی صداقت کا انحصار وارداتِ باطن پر ہے۔ اسلم انصاری کے خیال میں اگر اقبال کے خطبات میں مابعد الطبیعاتی عنصر غالب نہ ہوتا تو اُن کو عصرِ حاضر میں مسلمانوں کا سب سے بڑا عمرانی مفکر کہہ سکتے تھے۔

اقبال نے اِن خطبات میں جس وسعتِ مطالعہ، فکر کی گہرائی اور اسلامی مابعد الطبیعات کے بارے میں حیرت انگیز بصیرت کا اظہار کیا ہے، اور جدید سائنسی افکار سے جو غیر معمولی واقفیت بہم پہنچائی ہے، اسلم انصاری اپنی وسعتِ علمی کی بنا پر زیرِ نظر مضمون کے موضوع کی وسعت کو اجمالی انداز میں سمیٹنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

اگلے مضمون میں اسلم انصاری نے "خطباتِ اقبال پر ایک نادر تبصرہ" پر تبصرہ کیا ہے۔ زیرِ بحث تبصرہ، نامور مسلم اسکالر محمد مارماڈیوک پکتھال کا تحریر کردہ ہے، جو 1931ء میں خود انہی کی زیرِ ادارت حیدر آباد دکن شائع ہونے والے ایک سہ ماہی میگزین "اسلامک کلچر (انگریزی)" میں شائع ہوا۔ اسلم انصاری نے اِس تبصرے کو خطباتِ اقبال پر پہلا باقاعدہ علمی تبصرہ قرار دیا ہے۔ تاہم خطبات پر پہلا تبصرہ 15 مئی 1930ء کو روزنامہ "انقلاب" میں شائع ہوا۔

آغاز میں اسلم انصاری نے خطباتِ اقبال کی اہمیت بیان کرنے کے بعد مارماڈیوک پکتھال کی علمی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے قرآن پاک کا پہلا انگریزی ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے مدراس کی اُسی تنظیم کی دعوت پر تہذیب اسلامی کے عنوان سے آٹھ خطبات بھی دیے، جس کی دعوت پر اقبال نے اپنے خطبات مرتب کیے تھے۔

خطباتِ اقبال پر تبصرے کے آغاز میں محمد مارماڈیوک پکتھال نے خطبات کی فنی یا اصطلاحاتی زبان کو گم گشتہ یا کج فکر اذہان کی ضرورت قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اسلام کو جدید فلسفے کی زبان میں پیش کرنا مغرب کے بعض مخصوص اور محدود حلقوں کے لیے مناسب یا ضروری تھا، وگرنہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسلم انصاری نے میر غلام بھیک نیرنگ کے نام اقبال کے خط کا حوالہ دیا ہے، جس میں اقبال نے خطبات کو فلسفہ جدید کی زبان میں پیش کرنے کا ادعا کیا ہے۔ ان کا مقصد پرانے مذہبی افکار کی ترمیم و تنسیخ کرنا اور ان کے مخاطبین عام اُردو خواں طبقہ کے

بجائے فلسفہ کے بنیادی مسائل سے آگاہ افراد ہیں۔ اسلم انصاری کے خیال میں پکتھال نے اپنے تبصرے میں خطبات میں سے تین موضوعات میں دل چسپی لی ہے۔

1۔ عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں اقبال کی فلسفیانہ اور نفسیاتی توضیح
2۔ آدم وحوا کے بارے میں قرآنی روایات کی توضیحات
3۔ زمان ومکان کی ماہیت کے بارے میں اقبال کے فلسفیانہ استدراکات۔(9)

اسلم انصاری کے خیال میں مبصر خطباتِ اقبال کی اسلامی فکر کے احیاء کے حوالے سے اہمیت کے قائل نظر نہیں آتے، لیکن اس کے باوجود اسے خطباتِ اقبال پر پہلا علمی تبصرہ ہونے کا اعزاز حاصل رہے گا۔

اقبال کے فکر وفلسفے کا بھرپور اظہار اُن کی فارسی شاعری میں ہوا ہے۔ "فارسی شعر وادب میں اقبال کی فکری اور فنی ترجیحات" میں اسلم انصاری نے فارسی زبان اور شعر وادب سے اقبال کے فکر وتخیل کے رشتے کو موضوع بنایا ہے۔ مقالے کے آغاز میں اسلم انصاری نے اقبال کے نظریۂ شعر پر بحث کی ہے۔ اُن کا یہ خیال وقیع ہے کہ اقبال کے نزدیک شعر کی قدر وقیمت کا اندازہ اس کے فنی حسن سے کہیں زیادہ اس کے فکری اجزاء سے لگایا جاتا ہے اور وہ شعر کو انسانی خودی کی تکمیل کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

اسلم انصاری نے اُن فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے، جن سے اقبال نے اثر قبول کیا یا کم از کم جن کی عظمت کا اعتراف کیا۔ حافظ شیرازی کو اگرچہ اقبال ایشیا کا بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں لیکن فنی اسالیب کے لحاظ سے۔ اُس کی شاعری جس مستی اور بے فکری کو فروغ دیتی ہے، اقبال اُسے تعمیرِ خودی میں مانع سمجھتے ہیں۔ اسلم انصاری کے خیال میں حافظ کی شاعری پر اعتراض کرنے کے باوجود اقبال اس کے فنی کمالات کے معترف ہیں۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے بھی یہی بات کہی:

> فکر وخیالات میں نہ سہی کم از کم اسالیب کے معاملے میں حافظ سچ مچ اقبال کے ادبی پیر ومرشد ہیں۔(10)

جن فارسی شعراء نے اقبال کی فکر کو مہمیز کیا، اُن میں مولانا روم سرِفہرست ہیں۔ اقبال نے رومی کو اپنا پیر ومرشد مانا ہے اور 'جاوید نامہ' میں اُن کی رہنمائی میں سیر افلاک کی۔ مولانا روم کے حرکی اور ارتقائی تصورِ حیات سے اقبال نے فکری اعتبار سے جتنا استفادہ کیا، اتنا کسی دوسرے شاعر سے نہیں کیا۔ اقبال مولانا رومی کی علمی عظمت سے حد درجہ متاثر تھے، وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ رومی کی تعلیمات نے ہی اُن کی خاک کو اکسیر بنا دیا ہے۔ کارلائل نے دانٹے اور شیکسپیئر کو مغربی دنیا کے ہیرو شاعر قرار دیا، اسلم انصاری رومی اور اقبال کو مشرق کے بطلِ جلیل (ہیرو) مانتے ہیں۔

مولانا روم کے بعد اقبال نے فارسی کے جن شعراء کو کم وبیش یکساں حد تک سراہا ہے، وہ بیدل، غالب اور حکیم سنائی ہیں۔ انھوں نے غالب کی فلسفیانہ حیثیت کو 'جاوید نامہ' میں بھی تسلیم کیا ہے، لیکن اسلم انصاری کے بقول "اقبال غالب سے کہیں زیادہ بیدل کی فکری اور فنی عظمت کے قائل تھے"(11)۔ اسی طرح حکیم سنائی غزنوی کے متصوفانہ اور فلسفیانہ موضوعات سے بھی اقبال بہت حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شعری اور نثری تحریروں میں بہت جگہوں پر حکیم سنائی کا ذکر نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ کیا ہے۔

اقبال نے فکری و فنی حوالے سے بعض فارسی شعراء کی طرف اعتنا نہیں کیا۔ اسلم انصاری کے نزدیک شیخ سعدی کی گلستان و بوستان اگرچہ برصغیر کے اسلامی تمدن میں بہت اہم رہی ہے، لیکن اقبال کی رفعت اندیشہ کی جستجو کی تسکین سعدی شیرازی کے کلام سے نہ ہو سکی۔ اسی طرح فردوسی اور نظامی کی تخیلاتی شاعری اور حکیم خاقانی کے اخلاقی اور حکیمانہ افکار بھی اقبال کو متاثر نہ کر سکے۔ اقبال کی شاعری میں فردوسی، نظامی اور عمر خیام کا تذکرہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، البتہ محمود شبستری کی مثنوی 'گلشن راز' سے متاثر ہو کر اقبال نے 'گلشن راز جدید' لکھی۔

انھوں نے اقبال کے اردو کلام میں فارسی شعرا کی تضمینات کا جائزہ بھی لیا ہے، جن میں غنی کاشمیری سے اقبال کی عقیدت کا اظہار کچھ زیادہ ہی ملتا ہے۔ اس حوالے سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال کو اگر کسی شاعر کا کوئی ایک شعر بھی ایسا ملا، جو اسلوب یا معانی و مطالب کے اعتبار سے قابلِ قدر تھا، تو انھوں نے اس کی تضمین کی یا اُسے کسی ایسے عنوان سے نقل کیا ہے کہ شعر زندہ ہو گیا۔ عزت بخاری اور محوی دکنی کے اشعار کی مثالیں اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

دراصل اقبال کی مثال بھی اپنے پیش رو غالب کی طرح ایک ایسے جوہری کی سی ہے، جسے جہاں سے بھی کوئی قیمتی موتی ملا، اُس نے اسے حاصل کرنے میں تامل نہیں کیا۔ اپنی کئی انفرادی خصوصیات کے علاوہ اسلم انصاری اردو کے علاوہ فارسی زبان کے شعر و ادب کے فکری اور فنی دقائق پر بھی بہت گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ مضمون اُن کی فارسی زبان سے غیر معمولی دلچسپی اور فارسی شاعری کے وسیع اور غائر مطالعے کی غمازی کرتا ہے۔

'اقبال عہد آفریں' کے آٹھویں مقالے میں اقبال کی مختصر ترین مثنوی "بندگی نامہ" میں غلامی کے مختلف مضمرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اقبال نے جہاں فرد کی حریّت و حمیّت پر زور دیا ہے، وہاں غلامی کی زہرناکی کا بھی بارہا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

> اقبال کے نزدیک کسی تہذیب کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ اس میں انسانی فضیلت کو تسلیم کیا جائے اور اس میں افراد ذریعہ نہ ہوں بلکہ مقصود ہوں۔(12)

مضمون کی تمہید میں اسلم انصاری نے قبل مسیح کی مصری اور یونانی تہذیبوں میں شخصی غلامی کا مختصر احوال بیان کر کے اِسے انسانی تہذیب و تمدن کے جسم پر ایک بدنما داغ قرار دیا ہے۔ اسلام نے غلاموں کے ساتھ برابری اور مساوات کے قوانین متعارف کروائے تو بتدریج غلامی عملاً دنیا سے مفقود ہو گئی۔ لیکن اسلم انصاری کے نزدیک المیہ یہ ہے کہ جدید دنیا میں غلامی نے مال و زر اور اقتدار کی ہوس اور سیاسی بالادستی اور استعماریت کی صورت جنم لیا ہے۔

ویسے تو اقبال نے غلامی اور محکومی کے بارے میں اپنی تخلیقی قوت کا ایک معتدبہ حصہ صرف کیا ہے لیکن بندگی کے موضوع پر انھوں نے ایک مکمل مثنوی "بندگی نامہ" بھی تصنیف کی۔ 168، اشعار پر مشتمل یہ مثنوی 'گلشنِ راز جدید' کے ساتھ "زبورِ عجم" کے آخر میں تتمہ کے طور پر 1927ء میں شائع ہوئی۔ اقبال نے اس مثنوی میں غلاموں کی زندگی میں پائے جانے والے خلفشار پر تبصرہ کیا ہے۔ غلامی انسانی قلب و نظر کی موت کا سبب ہے۔ اس سے جوانی میں بڑھاپا اور بڑھاپے میں کڑواہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہ قوم کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے اور اس کے ٹکڑوں میں ٹکراؤ کی صورتِ حال پیش کرتی ہے۔

مثنوی کی تمہید میں "مہ گیتی فروز" کی زبانی خالقِ کائنات کے حضور شکوہ سنایا گیا ہے کہ یہ دنیا نورِ جاں سے واقف ہی نہیں۔ یا مجھے اِس عالمِ آب و گِل کی خدمت سے موقوف فرمایا پھر اس خاک سے کوئی نیا آدم پیدا کر۔ اس تمہید کے بعد "مہِ سیم گوں" ہی کی زبانی ایک عجیب و غریب جہنمی منظر کا نقشی کھینچ کر غلامی کے اثرات کا نہایت مؤثر بیان ہے۔ اسلم انصاری نے 'بندگی نامہ' اور 'جاوید نامہ' کا تقابلی جائزہ بھی لیا ہے اور دونوں مثنویوں میں جہنم کے مناظر میں مماثلت تلاش کی ہے۔ اُن کے خیال میں 'بندگی نامہ' نے ہی 'جاوید نامہ' جیسی عظیم تخلیق کرنے کی تحریک پیدا کی ہوگی۔

غلامی کے زیرِ سایہ ابھرنے والے نغمے زندگی کے بجائے موت کا پیغام دیتے ہیں۔ ایسے نغموں میں وجود کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اقبال نے مولانا روم کے ایک مصرع کے حوالے سے مثالی نغمے کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں کہ نغمہ ایسا ہو کہ دل سے غموں کا بوجھ اتار سکے۔ اس کے ترنم سے شعلہ بھڑکے اور وہ خاموشی کا حصہ بھی بن سکے۔ اور غلامی کے سائے میں تخلیق پانے والی مصوری میں بھی تحریک پیدا کرنے کی لیاقت نہیں ہوتی۔ اسلم انصاری نے اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالرحمن چغتائی کے نام اُس خط کا تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے، جس علامہ اقبال نے ہندوستانی مصوّری کے مختلف نمونے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ میں:

> جدید مصوّری سے بھی انھیں (اقبال کو) یہ شکایت ہے کہ اس میں وہ تو سب کچھ ہے، لیکن
> مصور کی ذات یعنی خودی کی نمود نہیں ہے، جو فرد اور قوم کے وجود کا اثبات کرتی ہو۔ (13)

اقبال فنِ تعمیر کے سوا دوسرے فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوّری اور کسی حد تک شاعری میں بھی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ اسلم انصاری، اقبال کی اس عدم اطمینانی سے استدراک کرتے ہیں کہ اقبال اسلامی فنون کے لیے کسی بے حد مثالی ہیئت کو ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔ 'مذہبِ غلاماں' کے بارے میں اقبال کا خیال ہے کہ محکوم کی مذہبی زندگی عشق سے خالی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے ہونٹوں پر خدا کا نام ہوتا ہے، مگر اس کا اصل آقا اُس کا بادشاہ ہوتا ہے۔ 'مردانِ آزاد' کے فنِ تعمیر کی بابت اقبال نے قطب الدین ایبک اور شیر شاہ سوری کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بالخصوص مسجدِ قوت الاسلام کا حوالہ دیتے ہیں، جس کی تعمیر میں پتھر کو پتھر سے اس طرح جوڑا گیا ہے، جیسے ایک عہد، ایک لمحے میں سما گیا ہو۔ اقبال کے نزدیک ان پتھروں میں ہمت مردانہ اور طبع بلند کے قیمتی جواہر چھپے ہیں۔ اسی طرح اقبال نے تاج محل کو ایک گوہرِ نایاب قرار دیا ہے اور اُسے قوت سے زیادہ عشق و محبت کا مظہر خیال کیا ہے۔

اسلم انصاری کے خیال میں غلامی اور بندگی کے موضوع پر شاید دنیا میں "بندگی نامہ" کے علاوہ کوئی اور نظم نہیں لکھی گئی۔ چونکہ "بندگی نامہ" میں بالواسطہ غلامی سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے، اس لیے اقبال نے "بندگی نامہ" کو غلامی کا نوحہ نہیں بننے دیا، کیوں کہ اس سے رحم دلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، جو فرد کو خود شناسی کی منزل سے دوری کا سبب بنتے ہیں۔ اسلم انصاری کا زیرِ نظر مضمون اُن کے حسنِ انتخاب، فارسی زبان سے لگاؤ اور عالمانہ بصیرت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری اور گفتگوؤں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فنونِ لطیفہ میں شاعری کے بعد فنِ تعمیر میں اُن کی دلچسپی گہری تھی۔ اسلم انصاری نے اپنے مضمون "اقبال کا ذوقِ تعمیر" میں اقبال کی اِسی دلچسپی کو موضوع بنایا ہے۔ مقالے کی ابتدا میں فنِ تعمیر کے نفسیاتی اور تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلم انصاری نے "بانگِ درا" کی نظم 'گورستانِ شاہی' کے اشعار سے یہ واضح کیا ہے کہ اِقبال فن میں ارفعیت اور

تخلیقی انا کی قوت کے اظہار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک فطرت کی نقالی اور اندھی تقلید 'بت گری' کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے اقبال کو 'پیرس کی مسجد' بت کدہ دکھائی دیتی ہے، کیوں کہ اس کی تعمیر کا محرک خودی یا عشق نہیں ہے۔ اس کے برعکس مسجدِ قوت الاسلام یا مسجدِ قرطبہ کی شان و شوکت سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اسلم انصاری کے خیال میں مسجدِ قوت الاسلام کے بارے اقبال کا ردعمل، حزن اور رنج وملال سے عبارت ہے، جب کہ مسجدِ قرطبہ نے اقبال کے اندر سوز و گداز اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا احساس پیدا کیا۔

اقبال مسجدِ قوت الاسلام اور مسجدِ قرطبہ کو محض فن کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ تعمیرات قوتِ حیات کی مظہر ہیں۔ اور اصلی فن وہی ہے جو زندگی کا مظہر ہو، زندگی کے انفعالی اور یاس آفریں پہلوؤں کا نہیں، بلکہ اس کی فعال قوتوں کا، جو ارتقائی اور انقلابی ہوں۔ اسلم انصاری ان مسجدوں کے تعمیر کو جذبۂ عشق اور "جاوید نامہ" میں مذکور سلاطینِ مشرق کے ہیروں اور جواہرات سے مزیّن فردوسی محلات کو اقبال کے تصورِ حرکت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلم انصاری کے خیال میں فنِ تعمیر کے جتنے پہلوؤں پر اقبال نے روشنی ڈالی ہے، شاید ہی کسی اور مفکر نے اس قدر جامع خیالات کا اظہار کیا ہو۔

اسلم انصاری کا استدلال ہے کہ یونانی، رومن اور ہندی طرز تعمیر میں رفعت و شکوہ اور تخلیقی انا کا اظہار مفقود ہے، اس لیے اقبال نے ان کی طرف اعتنا نہیں کیا۔ صرف اسلامی طرز تعمیر ہی ان کے معیارِ ذوق پر پورا اترتا ہے۔ اقبال کی نظم 'گورستانِ شاہی' میں اقبال نے یہ کہا تھا کہ قوم کی شانِ جلالی کا ظہور تاریخِ اسلام میں ہو چکا ہے، اب شانِ جمالی کے ظہور کا زمانہ ہے:

ہو چکا گو قوم کی جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور
(14)

لیکن فکر و تاثر میں ترقی کرتے ہوئے اور تقدیرِ امم کا جائزہ لیتے ہوئے بعد میں اُن کا زاویۂ نگاہ بدل گیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جلال کو جمال سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ جلال و جمال کا امتزاج انھیں اسلامی طرزِ حیات میں ہی نظر آیا۔

"اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر" کا جائزہ لینے کے لیے اسلم انصاری نے مضمون کے آغاز میں مغربی ادب بالخصوص یونانی اور انگریزی ادب کے تناظر میں ڈرامہ اور شاعری میں باہمی تعلق کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں نہایت بلیغ پیرائے میں ڈرامہ اور شاعری کے درمیان پائے جانے والے فطری ربط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلم انصاری نے پیامِ مشرق، بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم کی بعض نظموں اور ارمغان حجاز کی نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں مختلف ڈرامائی عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ ان ڈرامائی عناصر میں اندازِ تخاطب، خود کلامی، مکالمہ، کردار نگاری اور تجسیم و تمثیل وغیرہ شامل ہیں۔

اسلم انصاری کے خیال میں اقبال، جس شے کو بھی دیکھتے ہیں اُسے کردار میں بدل دیتے ہیں، وہ بے جان چیزوں میں نفسی حرکات کا سراغ لگاتے ہیں اور ان کے تشخص کا تعین کرتے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ بھی ہے کہ وہ کائنات کو متناہی اناؤں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے اگر انھیں ذرے ذرے میں تشخص اور انفرادیت کے آثار نظر آتے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ابن عربی سے لے کر مولانا روم

تک، صوفیا کے تذکروں اور شاعری میں ابلیس ایک اہم کردار رہا ہے۔ اقبال نے بھی اپنی نظموں میں ابلیس کے کردار کی تمثیلی رمزیت سے فکر انگیز مضامین پیدا کیے ہیں۔

اقبال کو ڈراما سے ایک خاص رغبت تھی لیکن سوال یہ ہے کہ اقبال نے باقاعدہ ڈراما کیوں نہ لکھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر اقبال کو ڈراما نگار کے لقب کا خوف نہ ہوتا تو شاید اپنے مغربی ہم دم، گوئٹے کی طرح وہ بھی کوئی فاؤسٹ لکھتے (15)۔ اسلم انصاری کے خیال میں اقبال شاید ان تین وجوہات کی بنا پر ڈرامہ نہیں لکھ سکے۔ اولاً یہ کہ اقبال کے دور میں اُردو ادب میں سٹیج اور ڈرامے کی کوئی زندہ روایت موجود نہ تھی۔ دوم یہ کہ ڈرامہ فنی اعتبار سے مغربی تھا، جبکہ اقبال کا مزاج مشرقی تھا اور تیسری وجہ شاید یہ تھی کہ اقبال کی نظر میں ڈرامہ، اداکار اور ناظر دونوں کی خودی کی نفی کرتا ہے۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تحقیق کے مطابق، اقبال نے ایک ڈرامہ 'خنجرِ ہلال' کو پسند کیا اور اس پر اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ اس ڈرامے کے مصنف کا نام منشی غلام قادر فرخ امرتسری تھا (16)۔ سید وقار عظیم کے خیال میں اگر اقبال ڈرامے کی طرف متوجہ ہوتے تو اُردو میں بھی کوئی ایسی تخلیق وجود میں آجاتی، جسے لوگ دوسری فردوسی گم گشتہ کہہ سکتے (17)۔ اسلم انصاری کا یہ مقالہ موضوع اور تجزیے کے اعتبار سے تازگی کا حامل ہے۔

بڑے شاعر کا لفظی تخیل نئی تراکیب اور بعض اوقات بالکل نئے الفاظ کی تشکیل کرتا رہتا ہے۔ مختصر مضمون "اقبال کا لفظی تخیل" میں 'جاوید نامہ' میں شامل کچھ ایسے ہی الفاظ کی توضیح و تشریح کی گئی ہے، جو اسلم انصاری کے مطابق اقبال کی اپنی اختراع اور ایجاد ہیں۔ اُن الفاظ میں زروان، زندہ رود، وادیِ یرغمید یا وادیِ طواسین، مرغدین، برخیا اور فرزمرز شامل ہیں

زروان، وہ روحِ زمان و مکاں ہے، جو مسافر کو عالمِ علوی کی سیاحت کے لیے لے جاتی ہے۔ زندہ رود سے مراد ہمیشہ بہنے والا دریا، یہ نام اقبال نے اپنے لیے چُنا۔ وادیِ یرغمید، وادیِ طواسین کے لیے استعمال کیا گیا، اسلم انصاری کے مطابق یرغمید اردو اور فارسی میں ایک بے معنی لفظ ہے۔ مرغدین، 'جاوید نامہ' میں فلک مشتری کے ایک شہر کا نام ہے، جب کہ برخیا اور فرزمرز اس شہر کے دو کرداروں کے نام ہیں۔ اسلم انصاری ان کرداروں کو ان کی شیریں بیانی، خوب روئی اور سادہ پوشی کی بنیاد پر کشمیری خیال کرتے ہیں۔

اسلم انصاری ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے شعری محاسن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون اُن کی اِسی عمیق نظری اور عمدہ ذوقِ مطالعہ کی دلیل ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے مطابق اسلم انصاری کی اپنی تخلیقی کاوشیں نفسِ مضمون کے سلسلے میں بہت معلومات افزاء ہیں۔ (18)

احمد شاہ درانی المعروف احمد شاہ ابدالی (1722ء-1772ء) اٹھارہویں صدی میں کشور کشائی اور سیاسی حکمتِ عملی کے لحاظ سے مغربی اور جنوب مغربی ایشیا کی ایک اہم شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں۔ اپنے جوشِ کردار، قوتِ عمل اور فقر و سلطانی کے انوکھے امتزاج کی بدولت وہ مغربی اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے امید، حرکت و عمل اور عروج و اقتدار کی علامت دکھائی دیتے ہیں۔ "اقبال اور احمد شاہ ابدالی" میں اسلم انصاری نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ اقبال کی گہری عقیدت کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

مضمون کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں "جاوید نامہ" کے آخری باب "آن سوئے افلاک" میں 'حرکت بہ کاخِ سلاطینِ مشرق' کے مقام پر اقبال کی احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہے۔ اس مقام پر ابدالی کے علاوہ اقبال کی نادر شاہ اور سلطان ٹیپو سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ مولانا روم کی زبانی ان سلاطینِ اسلام کو "خسروانِ مشرق" کہلوا کر زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اقبال کے سفر ِافغانستان کا ذکر ہے۔ اس سفر کے دوران اقبال نے احمد شاہ ابدالی کے مزار کی زیارت کی اور اپنے تاثرات مختصر مثنوی "مسافر" میں قلم بند کیے۔ اس مثنوی میں اقبال نے احمد شاہ ابدالی کی بہادری اور شاعری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ جواب میں روحِ ابدالی، اقبال کو جوش اور ولولہ کی ترغیب دیتی ہے۔

مقالے کے تیسرے حصے میں احمد شاہ ابدالی کے مختصر سوانحی حالات درج ہیں۔ نادر شاہ کو احمد شاہ ابدالی کی صلاحیتوں پر حد درجہ اعتماد تھا، نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی افغانستان کے بادشاہ مقرر ہوئے۔ ابدالی، حضرت شاہ ولی اللہ کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نیست و نابود کیا۔ شیر افضل بریکوٹی احمد شاہ ابدالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> احمد شاہ ابدالی بڑے بہادر، بیدار مغز، انصاف پسند اور منتظم بادشاہ تھے۔ افغان قبائل کو ایک ہی وحدت کی لڑی میں پرونے اور افغانیوں کے لیے قانون بنانے کے بانی تھے۔ شعر او ادبا کے قدردان تھے اور خود صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے۔ اقبال ان کے اخلاق انصاف اور رعیت پروری سے متاثر تھے۔(19)

ابدالی کو ملت اسلامیہ کے ساتھ حد درجہ ہمدردی تھی، اس نے دہلی کو فتح کرنے کے باوجود اسے پایہ تخت نہ بنایا۔ عمر بھر اپنے محسن نادر شاہ کے خاندان کے ساتھ عزت کا سلوک روا رکھا۔ سب سے بڑھ کر مرہٹوں کی ممکنہ بربریت کا خاتمہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے سوانحی حالات سے پتا چلتا ہے کہ وہ فقط جنگ جُو بادشاہ ہی نہ تھے، بلکہ ایک دوراندیش اور بالغ نظر دانشور بھی تھے۔ اسلم انصاری کے نزدیک اقبال کی احمد شاہ ابدالی کے ساتھ عقیدت کا سبب ان کا مثالی کردار ہے۔

آخری حصے میں "جاوید نامہ" میں احمد شاہ ابدالی کی زبانی اقبال سے کی گئی گفتگو پر بحث کی گئی ہے۔ ابدالی افغان قوم کے انتشار پر افسردہ نظر آتے ہیں۔ وہ ترک اور ایشیائی اقوام کی مغرب زدگی کا شکوہ کرتے ہیں، جو مغرب کی ظاہر پرستی کی نقالی تو کر رہی ہیں، لیکن علم و تحقیق میں اس کی پیروی نہیں کرتیں۔

اقبال ایشیائی اقوام کی آزادی کے خواہاں تھے۔ اس سلسلے میں اقبال کو ملتِ افغانیہ پر بہت توقعات تھیں، اِس لیے احمد شاہ ابدالی جو ملتِ افغان کے بانی تصور کئے جاتے ہیں، سے اقبال کی عقیدت ایک بدیہی امر ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اسلم انصاری نے اس عقیدت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اقبال اور احمد شاہ ابدالی کے فکری اشتراکات کو صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مقالے کو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ربط و ترتیب کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا۔ سوانح، مثنوی مسافر، جاوید نامہ اور جاوید نامہ پر محاکمہ کی ترتیب میں اگر مقالہ لکھا جاتا تو تفہیم و ابلاغ کی بہتر صورت پیدا ہو سکتی تھی۔

شاعری اور فلسفہ کے علاوہ اسلم انصاری کو مصوّری سے بھی لگاؤ ہے۔ اگلے مضمون میں انھوں نے عبدالرحمٰن چغتائی کے مرقعِ مصوّری "عملِ چغتائی" کے حوالے سے اقبال اور چغتائی کے فکر و فن پر گفتگو کی ہے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کا نام فنِ مصوری میں ایک مسلّم الثبوت استاد اور ایک صاحبِ طرز مصور کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ اُن کا خاندان لاہور کا ایک قدیم، معروف اور بہت بڑا معمار خاندان تھا، جس کا تعلق ایک معروف معمار استاد احمد معمارِ شاہجہانی سے ملتا ہے۔ چغتائی کو فنِ تعمیر اور نقش و نگاری کا فن ورثہ میں عطا ہوا۔ چغتائی نے مصوری کے مختلف دبستانوں سے فیض حاصل کیا۔ چغتائی نے مرزا غالبؔ کے دیوان کو "مرقعِ چغتائی" کے نام سے، جب کہ اقبال کی "جاوید نامہ" کو "عملِ چغتائی" کے نام سے مصوّر کیا۔

مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں شاعری اور مصوّری کے باہمی رشتے پر بحث کرنے کے بعد مشرقی مصوّری پر اہلِ مغرب کے بعض اعتراضات کے مدلل جواب دے کر چغتائی کی سوانح اور فن کا تعارف کروایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں نتیجہ خیز بحث کی گئی ہے کہ موضوع کے تقاضوں کے پیشِ نظر "جاوید نامہ" کی مصوّری کرتے ہوئے، چغتائی، اقبال کے ذہنی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے۔ اسلم انصاری کے خیال میں "جاوید نامہ" میں موجود ڈرامائیت اور تیز رو مناظر کو چغتائی اپنے مخصوص اُسلوب کے باعث گرفت میں لانے میں ناکام رہے ہیں۔

چغتائی کے اُسلوب میں غزل کی سی اشاریت اور رمزیت تو موجود ہے لیکن محاکات نگاری کا پہلو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موضوع کے حوالے سے "عملِ چغتائی" کے سلسلے میں "مرقعِ چغتائی" کی سی مناسبت پیدا کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اقبال کی ناطق اور متحرک تصویروں کو جب وہ پیش کرتے ہیں تو وہ خاموش خاموش نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اپنے مضمون "اقبال اور چغتائی" میں رقم طراز ہیں:

> کلام اقبال میں عمل اور حرکت کی کثرت اور چغتائی کے مزاج میں ان کا فقدان ہے، لیکن ایک بالغ نظر فن کار کی طرح چغتائی نے تلافی کی پوری کوشش کی ہے۔ وہ بعض اوقات عمل اور حرکت کو تصاویر کے پس منظر سے منسلک کر دیتا ہے۔ اور اس طرح فکرِ اقبال تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی تلافی فکری عنصر کی موجودگی سے بھی ظاہر ہوئی ہے۔(20)

آخری حصے میں "عملِ چغتائی" کی کم و بیش ایک سو تصاویر میں سے تیس تصاویر کا انتخاب اور مختصر تعارف کروا کر "مرقعِ چغتائی" اور "عملِ چغتائی" کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اسلم انصاری کا یہ مضمون فنِ مصوّری اور اقبالیات کے حوالے سے ان کے وسیع تر شعور کا عکاس ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے اس مقالے کو کتاب کا سب سے اچھا مقالہ قرار دیا ہے۔(21)

اقبال نے جس دور میں شاعری شروع کی، وہ دور انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کے بعد سیاسی بیداری کا دور تھا۔ اُس دور میں یہاں بسنے والے لوگوں میں سیاسی بیداری کا جوش اور انگریز کی غلامی و محکومی سے نفرت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اقبال ایک حساس اور دردمند دل کے مالک تھے، لہٰذا وہ بھی اس رو سے لاتعلق نہ رہ سکے۔ انہیں اپنے ملک و قوم کی غلامی کا شدید احساس تھا، جس کا اظہار اُن کی ابتدائی نظموں میں نمایاں ہے۔ "ہمالہ" اُن کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں بھی انہی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

لیکن اسلم انصاری نے اس نظم کے "تجزیاتی مطالعے" میں اس نظم کا ایک اور زاویے سے جائزہ لیا ہے۔ اُن کے خیال میں یہ نظم کسی ایسی طویل نظم کا ابتدائیہ ہے، جو لکھی نہیں گئی۔ اپنے اِس مؤقف کے حق میں انھوں نے پہلی دلیل کے طور پر علامہ بھیک نیرنگ کے مضمون "اقبال کے بعض حالات" کا حوالہ دیا ہے کہ جس کی رُو سے اقبال کے دل میں طویل نظم لکھنے کی خواہش ایّامِ طالبِ علمی ہی سے موجزن تھی۔ مخزن کو اشاعت کے لیے دینے میں اقبال کے مسلسل پس و پیش کو دوسری دلیل کے طور پر لیا گیا ہے۔ نظم کے آخری بند کو اسلم انصاری گریز کی صورت لیتے ہیں، جو بقول اُن کے "پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں اختتامی بند نہیں بلکہ گریز کا ٹکڑا ہوں"۔(22)

آخری بند کو گریز یا گریز کا ٹکڑا قرار دینا قرینِ قیاس ہے کہ اس بند میں مناظرِ فطرت کے بیان سے انسانی تمدن کی طرف اشارہ تو ملتا ہے۔ گویا اقبال آگے چل کر شاید برصغیر کی تمدنی تاریخ کو منظوم کرنا چاہتے تھے، جو نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، "ہمالہ اور سرگزشتِ آدم" کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ہمالہ سے سرگزشتِ آدم (1904ء) تک علامہ اقبال کی شاعری کو فطرت پسندی کا دور کہا جاتا ہے، جس کے بارے میں ناقدینِ اقبال متفق الرائے ہیں کہ ان کی دل چسپی اس زمانے میں بھی فطرت کے خارجی پہلوؤں کے خاموش مظاہر تک محدود نہ تھی۔ وہ خاموش مظاہرِ فطرت میں تکوینی اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں، لیکن ان کی توجہ کا اصل مرکز متحرک مظاہرِ فطرت ہیں، جن سے وہ کاروانِ حیات کے آگے بڑھنے کی صلاحیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر تقدیرِ انسانی پر غور کرنے لگتے ہیں۔ نظم 'ہمالہ' سے اس فلسفیانہ جستجو کی ابتدا ہوتی ہے اور 'سرگزشتِ آدم' میں اقبال بالآخر چشمِ مظاہر پرست کے وا ہو جانے کا اعلان کرتے ہیں۔(23)

اگلا مضمون "اقبال اور نسلِ نو" دراصل ایک تقریر کا متن ہے، جو اسلم انصاری نے نوجوانوں کی ایک انجمن میں کی۔ تقریر کا آغاز غالبؔ کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
(24)

اقبال ایک رجائیت پسند شاعر ہیں۔ اُن کا پیغام امن، ترقی، خوشحالی، محبت اور سربلندی کا پیغام ہے۔ وہ انسانیت بالخصوص امتِ مسلمہ کے روشن اور بلند مستقبل کے خواہاں تھے۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنی تمام امیدیں نوجوان طبقے سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ نوجوان نسل ہی قوم کا مستقبل ہے، اگر یہ نسل مہذب، تعلیم یافتہ، باصلاحیت اور روشن دماغ ہو گی تو قوم کا مستقبل تاب ناک ہو گا۔ گویا قوم کا مستقبل نسلِ نو کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ دعا مانگتے ہیں کہ اے خدا "جوانوں کو پیروں کا استاد کر"۔

اقبال کی شاعری میں شاہین کا بہت تذکرہ ہے۔ اسلم انصاری کے نزدیک شاہین اقبال کے ہاں بنیادی طور پر نسلِ نو کا استعارہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو خصوصیات شاہین میں ہیں، وہ نوجوانوں میں بھی پیدا ہو جائیں۔ اقبال نے "جاوید نامہ" کے آخر میں ایک نظم "خطاب بہ جاوید" لکھی ہے، اس کا ذیلی عنوان 'سخنے بہ نژادِ نو' ہے۔ اسلم کے بقول اقبال نے اس نظم میں دراصل نسلِ نو سے خطاب کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے

یہ مضمون عمومی نوعیت کا ہے اور بنیادی طور پر یہ ہے بھی نوجوانوں کی ایک انجمن سے خطاب، لیکن اسلم نے اسے کتاب میں شامل کر کے جہاں نوجوانوں سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے، وہیں اقبال کو بھی نسلِ نو کا معلم، ناصح اور مصلح بنا کا پیش کیا ہے۔

"سنگ و خشت یا افکارِ تازہ (اقبال کا ایک شعر)" اسلم انصاری کا یہ مضمون اُن کی ایک ریڈیائی تقریر کا متن ہے، جس میں اقبال کے اِس شعر کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
(25)

شعر کے تناظر میں عنوان میں ہی یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ جہانِ تازہ پیدا کرنے کے لیے سنگ و خشت کی ضرورت ہے یا افکارِ تازہ کی۔ اسلم انصاری نے اس مضمون میں اقبال کے ہاں استعمال ہونے والی اُن تراکیب کے بارے میں بات کی ہے، جو اُن کے ذوقِ تعمیر، احساسِ آزادی، جذبۂ حریّت اور تصورِ فن کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے ہاں جہانِ تازہ اور سنگ و خشت کی تراکیب جس فنی لطافت کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں، اس سے شعر پڑھتے ہی قصرِ زہرہ، مسجدِ قرطبہ، تاج محل اور بادشاہی مسجد کی طرف خیال جاتا ہے۔ لیکن کوئی بھی عظیم عمارت تخلیقی شعور اور تخلیقی حرکت کے بغیر وجود میں نہیں آتی، اس لیے سنگ و خشت کی دنیا آباد کرنے سے پہلے اپنے باطن کی دنیا آباد کرنا ضروری ہے۔ اگر زندگی میں شعور کی تازگی اور جدت کا عنصر ناپید ہو جائے تو مادے کی بے رحم میکانیت زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے اور انسان دوسرے حیوانوں کی طرح محض اپنی جبلی ضرورتوں کی تسکین تک محدود ہو جاتا ہے۔ سنگ و خشت کا استعارا مادے کے لیے ہے اور افکارِ تازہ کا تعلق خیال کی وسعت اور اہمیت سے ہے۔

اسلم نے اس مضمون میں ایک شعر کی تراکیب سے اقبال کی فکر کو ماضی اور حال کے پس منظر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ خطیبانہ اور فلسفیانہ اُسلوب کا حامل یہ مضمون قاری کو غور و فکر اور عمل کی دعوت دیتا ہے۔

"اقبال شخص اور شخصیت۔۔۔ ایک نظر میں" کتاب کا آخری مضمون ہے، جس کا آغاز ایک خط سے ہوتا ہے جو اقبال نے عطیہ فیضی کے نام لکھا تھا۔ اس خط کے تجزیے سے اسلم انصاری نے اقبال کی شخصیت کے چند گوشے ترتیب دیے ہیں۔

اجمال اس مضمون کا یہ ہے کہ اقبال نے سیدھی سادی، دیانت دارانہ اور منافقت سے پاک اور بے پناہ تخلیقی عمل سے بھرپور زندگی گزاری۔ وہ اہلِ کمال کی صحبت میں رہنا پسند کرتے اور اُن کی علمی فضیلت اور خصائص کا برملا اعتراف کرتے۔ ہر سوال کا جواب علمی نقطۂ نظر سے دیتے۔ وہ زندگی کے ہر تجربے، خیال اور صورتِ حال کو تخلیقیت میں ڈھال لیتے۔ حمید احمد خان نے بھی اُن کی اس کیفیت کا ذکر کیا ہے:

> یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھے اور یہ محسوس نہ کرے کہ اقبال کی پوری ہستی کی بنیاد غور و فکر پر قائم ہے۔ گفتگو میں ذرا وقفہ آیا اور اقبال کا ذہن ایک جست میں کائنات کی حدوں کو عبور کر کے وہاں جا پہنچتا، جہاں ہمارا عام شعور و شغف قدرت کے سرمدی سکوت میں گم ہو جاتا ہے۔(26)

تمام عمر والدین اور اساتذہ کے تابع فرمان رہے اور بھائی کے احسانات کو نہ بھولے۔ ظرافت آپ کے مزاج کا حصہ تھی۔ خطوں کا جواب دینے میں فیاض تھے۔ خوش خط تھے، موسیقی سے لگاؤ رکھتے تھے اور عام محفلوں میں شعر سنانے سے گریز کرتے تھے۔ صوفیا اور اولیاء کے مزاروں پر حاضری دیتے تھے، لیکن زوال پذیر تصوف کے خلاف تھے۔ نہ فضول خرچ تھے نہ کنجوس، زندگی میں شاذ ہی کسی کے مقروض ہوئے۔ اقوامِ عالم میں جرمن اور ترک قومیں پسندیدہ تھیں۔ آبائی وطن کشمیر اور اسلامی دنیا سے بے پناہ محبت کرتے۔ دنیاوی زندگی کو ترجیح دینے کے بجائے امتِ مسلمہ کے احیا و اتحاد کے لیے سرگرم رہے۔ آنحضور ﷺ سے ان کی عقیدت عشق کی حد تک تھی۔

مشہور شخصیت کے بارے میں ہمارا عمومی رویہ ہے کہ ہماری توجہ اُس شخصیت کے غالب پہلو پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ اقبال کے بارے میں بھی ہمارا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ ان کی شخصی زندگی پر حاوی ہو گیا ہے لیکن اسلم انصاری نے اس مضمون میں اقبال کی متوازن اور اعتدال پسند شخصیت کے ساتھ انصاف کیا ہے اور نہایت اختصار، جامعیت اور خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اسلم انصاری اُردو اور فارسی زبان و ادب کے مزاج سے آگاہی کے ساتھ ساتھ مغربی کلاسیک اور جدید ادب کے نقطہ ہائے نظر سے بھی شناسائی رکھتے ہیں۔ تاریخ اور فلسفے کے وہ باقاعدہ اور تمام عمر سنجیدہ طالبِ علم رہے ہیں۔ اقبال کا مطالعہ انہوں نے اپنی عمر کے مختلف حصوں میں کیا۔ پہلے وہ اقبال سے شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے، پھر خطباتِ اقبال سے فلسفہ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے مفکرِ اسلام کی حیثیت سے۔ "اقبال عہد آفریں" میں موضوعات کا تنوع، اسلم انصاری کی مذکورہ عملی جہات کا عکاس، وسعتِ مطالعہ پر دال اور دل آویز نقطہ آفرینوں کا غماز ہے۔

حوالہ جات و حواشی:

1۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 2010ء)، ص408

2۔ مولانا صلاح الدین احمد، "اقبال کے کوہ صحر"، مشمولہ اقبال بحیثیت شاعر، مرتب: رفیع الدین ہاشمی (لاہور: مجلس ترقی ادب، اکتوبر 2007ء، طبع دوم)، ص241

3۔ سید جابر علی، اقبال ایک مطالعہ (لاہور: بزمِ اقبال، 1985ء)، ص134

4۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، شذراتِ فکرِ اقبال (لاہور: مجلس ترقی ادب، مئی 1983ء، طبع دوم)، ص79، 130، 140

5۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، اقبال عہد آفریں (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2011ء، طبع اوّل)، ص99

6۔ ڈاکٹر وحید قریشی، اساسیاتِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1992ء)، ص204

7۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، اقبال عہد آفریں، ص107

8۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، خطباتِ اقبال۔ تسہیل و تفہیم (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2011ء)، ص22

9۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، اقبال عہد آفریں، ص127

10۔ ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اور فارسی شعرا (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1977ء)، ص334

11۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، اقبال عہد آفریں، ص134

12۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، روحِ اقبال (لاہور: آئینۂ ادب، 1969ء)، ص196

13۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے، ص252

14۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو) (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2007ء، طبع ہشتم)، ص184

15۔ڈاکٹر سیّد عبداللہ، "اقبال کا ادبی فن"، مشمولہ اقبال بحیثیت شاعر، مرتب: رفیع الدین ہاشمی، ص47
16۔ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال ایک تحقیقی مطالعہ (لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، 1996ء، طبع دوم)، ص16
17۔سیّد وقار عظیم، اقبال۔ شاعر اور فلسفی (لاہور: تصنیفات، 1968ء)، ص126
18۔اسلوب احمد انصاری، تبصرہ: اقبال عہد آفریں، مشمولہ نقد و نظر (شش ماہی)، علی گڑھ، 1988ء، ص201
19۔شیر افضل خان بریکوٹی، اقبال میرا ہم سفر (منگورہ سوات: شعیب سنز پبلشرز، 2007ء)، ص356
20۔ڈاکٹر وحید قریشی، اساسیاتِ اقبال، ص243
21۔اسلوب احمد انصاری، تبصرہ: اقبال عہد آفریں، مشمولہ نقد و نظر (شش ماہی)، علی گڑھ، ص201
22۔ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر اقبال عہد آفریں، ص243
23۔ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، بیانِ اقبال۔ نیا تناظر (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2008ء)، ص29
24۔ڈاکٹر اسلم انصاری، اقبال عہد آفریں، ص249
25۔ایضاً، ص258
26۔پروفیسر حمید احمد خاں، اقبال۔ شخصیت اور شاعری (لاہور: بزمِ اقبال، 1997ء، طبع سوم)، ص17

ماخذات:

ارشاد شاکر اعوان، ڈاکٹر، بیانِ اقبال۔ نیا تناظر (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2008ء)
اسلم انصاری، ڈاکٹر، اقبال عہد آفریں (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2011ء، طبع اوّل)
اسلوب احمد انصاری، تبصرہ: اقبال عہد آفریں، مشمولہ نقد و نظر (شش ماہی)، (علی گڑھ، 1988ء)
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، شذراتِ فکرِ اقبال (لاہور: مجلس ترقی ادب، مئی 1983ء، طبع دوم)
جابر علی، سید، اقبال ایک مطالعہ (لاہور: بزمِ اقبال، 1985ء)
جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال۔ تسہیل و تفہیم (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2011ء)
حسن اختر ملک، ڈاکٹر، اقبال ایک تحقیقی مطالعہ (لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، 1996ء، طبع دوم)
حمید احمد خاں، پروفیسر، اقبال۔ شخصیت اور شاعری (لاہور: بزمِ اقبال، 1997ء، طبع سوم)
رفیع الدین ہاشمی (مرتب)، اقبال بحیثیت شاعر، (لاہور: مجلس ترقی ادب، اکتوبر 2007ء، طبع دوم)
سیّد وقار عظیم، اقبال۔ شاعر اور فلسفی (لاہور: تصنیفات، 1968ء)
شیر افضل خان بریکوٹی، اقبال میرا ہم سفر (منگورہ سوات: شعیب سنز پبلشرز، 2007ء)
علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو) (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2007ء، طبع ہشتم)
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 2010ء)
محمد ریاض، ڈاکٹر، اقبال اور فارسی شعرا (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1977ء)
وحید قریشی، ڈاکٹر اساسیاتِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1992ء)
یوسف حسین خاں، ڈاکٹر، روحِ اقبال (لاہور: آئینۂ ادب، 1969ء)

References:

1.Dr. Farman Fatehpuri, Sub kay Liay (Lahore: Al-Waqar Publications, 2010), p. 408

2.Maulana Salahuddin Ahmed, "Iqbal kay Koh o Sahra", including Iqbal Ba Haisiat Shair, compiled by Rafiuddin Hashmi (Lahore: Majlis-e-Tarqi-e-Adab, October 2007, second edition), p. 241

3.Syed Jaber Ali, Iqbal Aik Mutala (Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1985), p. 134

4.Dr. Iftikhar Ahmed Siddiqui, Shazrat-e-Fikr-e-Iqbal (Lahore: Majlis-e-Tarqi-e-Adab, May 1983, second edition), p. 79, 130, 140

5.Dr. Aslam Ansari, Iqbal Ehd Afareen (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2011, first edition), p. 99

6.Dr. Waheed Qureshi, Asasiyat-e-Iqbal (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1992), p. 204

7.Dr. Aslam Ansari, Iqbal Ehd Afareen, p. 107

8.Dr. Javed Iqbal, Khutbat-e-Iqbal. Tasheeel o Tafheem (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2011), p. 22

9.Dr. Aslam Ansari, Iqbal Ehd Afareen, p. 127

10.Dr. Muhammad Riaz, Iqbal Aur Farsi Shuara (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1977), p. 334

11.Dr. Aslam Ansari, Iqbal Ehd Afareen, p. 134

12.Dr. Yusuf Hussain Khan, Rooh-e-Iqbal (Lahore: Ain-e-Adab, 1969), p. 196

13.Dr. Farman Fatehpuri, Iqbal Sub Kayliay, p. 252

14.Allama Iqbal, Kalyat-e-Iqbal (Urdu) (Lahore: Iqbal Academy, Pakistan, 2007, 8th edition), p. 184

15.Dr. Syed Abdullah, "Iqbal Ka Adabi Maqam", including Iqbal Ba Haisiat Shair, compiled by Rafiuddin Hashmi, p. 47

16.Dr. Hassan Akhtar Malik, Iqbal Aik Tahqiqi Mutala (Lahore: Iqbal Academy, Pakistan, 1996, 2nd edition), p. 16

17.Syed Waqar Azim, Iqbal.Shaar and Falsafi (Lahore: Tasnifat, 1968), p. 126

18.Asloob Ahmed Ansari, Commentary: Iqbal Ahd Afareen, including Naqdo Nazar (six-monthly), Aligarh, 1988, p. 201

19.Sher Afzal Khan Brikoti, Iqbal Mera Hum Safar (Mingora Swat: Shoaib Sons Publishers, 2007), p. 356

20.Dr. Waheed Qureshi, Asasiyat-e-Iqbal, p. 243

21.Osloob Ahmed Ansari, Tabsara: Iqbal Ehd Afrin, Encloded Naqdo Nazar (Six-monthly), Aligarh, p. 201

22.Dr. Aslam Ansari, Dr. Iqbal Ehd Afrin, p. 243

23.Dr. Irshad Shakir Awan, Bayan-e-Iqbal. Naya Tanazur (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2008), p. 29

24.Dr. Aslam Ansari, Iqbal Ehd Afrin, p. 249

25.Ibid., p. 258

26.Professor Hameed Ahmed Khan, Iqbal. Sakhsiat Aur Shairi (Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1997, 3rd edition), p. 17